اِسلامی ادَب کی تحریک: پس منظر، اثرات، نتائج

طارق حبیب

Abstract:

This aritcle throws light on background, basis and contribution of the movement of Islamic Literature in Urud. At the time of independence, identifications of roots and principles for the culture of new country and search of patterns for the culture and creation was the question of the times. Idea of Islamic Literature was one of the answers. It was the kind of literature based on the Islam and idealogy of Pakistan. Many writers gave attention to this idea. It was also widely criticized but no doubt it was a serious literature approach.

جب کسی معاشرے، کسی قوم، یا کسی شعبۂ حیات میں کوئی تحریک جنم لیتی ہے، تو دراصل وہ اُس کے کسی مقصد کا جھنڈا بلند کرتی ہے، نیز ایک استعارے کی حیثیت کی حامل، کسی خاص نقطۂ نظر کی غماز اور کسی مخصوص اُسلوبِ فکروفن کی ترجمان ہوا کرتی ہے؛ اب چاہے وہ ایہام گوئی کی تحریک ہو، فورٹ ولیم کالج کی تحریک ہو، دہلی کالج کی تحریک ہو، علی گڑھ تحریک ہو، انجمنِ پنجاب کی تحریک ہو، رومانوی تحریک ہو، ترقی پسند تحریک ہو، حلقہ اربابِ ذوق کی تحریک ہو، اسلامی ادب کی تحریک ہو، پاکستانی ادب کی تحریک ہو، یا ارضی وثقافتی تحریک ہو؛ ہر تحریک کا کوئی نہ کوئی بنیادی اُصول، نقطۂ نظر، معروف اُسلوب اور اساسی مقصد ضرور ہوا کرتا ہے، جس کی وہ تحریک محافظ ومبلغ ہوا کرتی ہے۔

فطرت کے قوانینِ حرکت میں سے ایک یہ ہے کہ ہر عمل کا ایک مساوی، مگر مخالف ردِعمل ہوا کرتا ہے۔ اُردو زبان وادب کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو آغازِ کار میں ہمیں ریختہ کی تحریکیں دکھائی دیتی ہیں، پھر ایہام گوئی کی تحریک نے جنم لیا، جس کے ردِعمل میں الہام گوئی تولّد پذیر ہوئی۔ مسلمانوں کی شکست کا عمل تو ۱۷۰۷ء ہی میں اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے ساتھ شروع ہوگیا تھا اور انگریز آہستہ آہستہ اپنا تسلّط اور اقتدار بڑھانے لگا اور

ایک نو آبادیاتی نظام پروان چڑھنے لگا؛ یوں ہوسِ اقتدار اور پورے ہندوستان کو محکوم بنانے کے لیے زبان کا سہارا لیا گیا۔ اِس غرض کے پیشِ نظر ۱۸۰۲ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج وجود میں آیا اور فورٹ ولیم کالج تحریک کا آغاز ہوا۔ اِس تحریک کے یقیناً کئی ایک سیاسی مقاصد تھے، تاہم اِس تحریک کے باعث زبان و ادب اُردو کو جو فائدہ پہنچا، اُس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۸۵۷ء تک یہ تسلُّط اپنے تکمیلی مراحل طے کر چکا اور پھر مختلف اعمال و اسباب کے ردِعمل کے طور پر تحریکِ علی گڑھ کی ابتدا ہوئی؛ اگر انگریز سرزمینِ ہندوستان پر اِس بُری طرح قابض نہ ہوتے، جیسے کہ وہ ہوئے، تو شاید تحریکِ علی گڑھ کا ابھرنا ممکن نہ تھا۔ اِس تحریک کے محرکات سیاسی، سماجی، علمی، ادبی اور ثقافتی نوع کے حامل تھے، لہٰذا یہ تحریک بھی اِنھی عوامل کی حامل قرار پائی۔ یہ بات بڑی اہم ہے کہ علی گڑھ تحریک کے اثرات مقامیت کا شکار نہ تھے، بلکہ یہ علاقائی اور مقامی تحریک کے بجائے قومی سطح کی علمی، ادبی اور شعور کی بیداری کی تحریک تھی۔

رومانوی تحریک جو علی گڑھ تحریک کے ردِعمل کے طور پر وجود میں آئی، دراصل علی گڑھ کے اُسلوبِ بیان کی اُکتا دینے والی سادگی اور سپاٹ لہجے سے اُکتاہٹ کا نتیجہ ثابت ہوئی۔ علی گڑھ تحریک کے حاملین کے سامنے مقصد بہت بڑا اور پھیلا ہوا، جب کہ وقت اور وسائل بہت کم تھے؛ چوں کہ اُن کے پاس اپنی بات کو جلد سے جلد، زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانا ضروری تھا، اِس لیے اُنھیں اپنی بات کے بیان کے لیے حسنِ بیان سے زیادہ ابلاغ کی فکر تھی، جس کے باعث زبان کا خارجی حُسن متاثر ہوتا چلا گیا۔ رُومانوی تحریک کے پیشِ واؤں کے سامنے ایسے مسائل نہ تھے، نہ اُن کے سامنے کوئی ملک گیر یا قوم گیر مقصد تھا، اُن کی فکر، فنی محاسن کے معدوم ہو جانے کے باعث متحرک ہوئی اور اِس طرح رومانوی تحریک نے جنم لیا۔ گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ رومانوی تحریک ہمیشہ کسی یک سانیت سے اُکتاہٹ کا ثمر ہوا کرتی ہے۔ رُومانیت کی ضد کے طور پر جب حقیقت پسندی کی تحریک کا آغاز ہوا، تو اُس کے سامنے ایک مقصد تھا؛ ایک منزل کا تعیُّن تھا اور اُس کا ایک باقاعدہ منشور تھا۔ پریم چند کے الفاظ یوں ہیں:

> ''ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اُترے گا، جس میں تفکُّر ہو، آزادی کا جذبہ ہو، حسن کا جوہر ہو، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو، جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے، سلائے نہیں، کیوں کہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔''(۱)

ترقی پسند یا حقیقت پسند تحریک نے بہ ذاتِ خود رومانوی تحریک سے اثرات جذب کیے اور پھر اپنی ایک سمت طے کی۔ رومانوی تحریک خواب و خیال کی دُنیا میں آباد تھی، جب کہ ترقی پسند تحریک زندگی کے حقائق کی علَم برداری کی دعویٰ گزار تھی؛ لیکن آگے چل کر اِس تحریک کے حاملین نے بھی حقائق کے راستے بدل لیے اور ایک خاص نوع کی شدّت اختیار کر لی۔ یہ شدّت محض سیاسی اور ادبی نوعیت کی حامل ہوتی، تو بھی اسے قبول کیا جا سکتا تھا، لیکن اِس شدّت کا دھارا اسلام کی روح کو متاثر کرنے کے درپے ہو گیا اور اِس کی زد میں اسلامی نظریات اور طرزِ حیات آ گئے اور یوں اپنی ایک واضح تہذیبی شناخت کا سوال اُبھر کر سامنے آ گیا، یعنی مسلمان بہ حیثیتِ قوم کہاں کھڑے ہیں اور اِسے کہاں کھڑا ہونا چاہیے؟ چوں کہ پاکستان کی بنیاد میں جو پتھر رکھے گئے تھے، وہ اِسلامی اُصول و قوانین سے

عبارت تھے، اِس لیے زندگی اور ادب کے بنیادی رویوں کو تبدیل کرنے کی ضرورت، شدت اختیار کر گئی اور یہ نتیجہ سامنے آیا کہ ایسا ادب تخلیق کیا جائے، جو اسلامی اقدار کا نمایندہ ہو، جس کی ہر صنف سے اسلام کی فکر ہویدا ہو اور جو پاکستانی مسلمانوں کو ایک جداگانہ تشخص عطا کرے؛ یوں ردِعمل کی جنگ کے نتیجے میں اسلامی ادب کی تحریک کا آغاز ہوا۔ ویسے تو اِس ضمن میں ڈاکٹر انور سدید نے نجات اللہ صدیقی کی محترم اور مبنی بر حقیقت رائے(۲) ''اُردو ادب کی تحریکیں'' میں یوں پیش کی ہے کہ:

> ''اُردو چوں کہ مسلمانوں کے عہدِ اقتدار میں پروان چڑھی، اِس لیے اِسے بالعموم مسلمانوں کی زبان تصوّر کیا گیا۔ سترھویں صدی کے وسط میں برصغیر کے مسلمانوں نے اِس زبان میں تخلیقی اظہار شروع کر دیا تھا؛ چناں چہ یہ کہنا درست ہے کہ اُردو زبان و ادب میں اِسلامی تحریک روزِ اوّل سے جاری تھی۔''(۳)

یہی بات حافظ محمود شیرانی نے ''پنجاب میں اُردو'' میں زبانِ اُردو کی پیدائش کا مقدمہ پیش کرتے ہوے بیان کی:

> ''اصل یہ ہے کہ اُردو کی داغ بیل اُسی دِن سے پڑنی شروع ہوگئی تھی، جس دِن سے مسلمانوں نے ہندوستان میں آ کر توطُّن اختیار کیا۔''(۴)

تاہم ایک باقاعدہ نقطۂ نظر اور منضبط شرائط و اُصول کے ساتھ اور ترقی پسند تحریک کے اشتراکیت آمیز، باغیانہ اور شدت پسندانہ افکار کے ردِعمل کے طور پر ''اسلامی ادب کی تحریک'' کا آغاز ۱۹۴۹ء میں ہوا۔ اِس تحریک کی بنیادیں اُستوار کرنے میں نعیم صدیقی، اسعد گیلانی، ابنِ فرید، فروغ اَحمد، نجم الاسلام، خورشید اَحمد، اَسرار اَحمد سہاوری وغیرہ کے نام اہم ہیں، جنھوں نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تعلیمات سے استفادہ کرتے ہوے تحریک کی نظریہ سازی کی، یوں یہ واضح طور پر ایک مقصدی ادب کی تحریک قرار پائی۔ آگے چل کر کئی اور اُدبا و شُعرا اِس میں شامل ہو گئے، جن کا ذکر ذرا بعد میں کیا جاتا ہے۔ تحریکِ ادبِ اسلامی کے اُبھرنے کی صورتِ حال کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر نے بھی مختصر سی رائے دی ہے کہ ترقی پسند مصنفین کے مقابل:

> ''(اور مخالف بھی) وہ دانش ور اور اہلِ قلم تھے، جنھوں نے نئی دھرتی کو وطن تسلیم کر کے اس سے جذباتی امیدیں وابستہ کر لیں۔ ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر، محمد حسن عسکری، ممتاز شیریں نے پاکستانی ادب (قومی ادب/ اصلاحی ادب) کی بحث شروع کی تو یہ خاصی متنازعہ ثابت ہوئی .....تاہم یہ بات اتنی غلط نہ تھی، جتنی اُس وقت محسوس ہوئی ہوگی کہ ہماری اور ہمارے ادب کے تشخص کی اساس پاکستانیت پر بھی اُستوار ہو سکتی ہے۔''(۵)

شاید ڈاکٹر سلیم اختر کا اشارہ اُس عہد کے سیاسی منظر نامے کی طرف ہو، تاہم اُنھوں نے ''اسلامی ادبی تحریک'' کے تفصیلی اسباب و محرکات، نتائج اور اثرات سے کوئی بحث نہیں کی ہے۔ تحریکِ ادبِ اسلامی کے حوالے سے محمد حسن عسکری نے معاشرتی اور تہذیبی مباحث میں خاطر خواہ حصہ لیا اور اِسی سطح پر ادب کی تفہیم کا چارہ کرنے کی کوشش

کی(۶)، وہ لکھتے ہیں:

> ”ہم نے اپنے آپ کو خود اپنی تاریخ سے بھی الگ کر لیا ہے۔ ہم اپنے نئے پن کے ایسے قائل ہیں کہ تیرہ سو سال میں مسلمانوں نے جو کچھ کیا ہے، وہ ہمارے لیے قابلِ قبول ہی نہیں۔ اصل قائل تو ہم ایک ہی بات کے ہیں: اپنے ذہنی تعطّل کے۔ اور ہماری جدوجہد کا ماحصل یہی ہے کہ کسی طرح تعطّل قائم رہے۔ اس کا ذریعہ یہ ہے کہ نہ اوروں کے خیال اور عمل پر سنجیدگی سے غور کرو، نہ اپنی تاریخ پر۔“(۷)

تشکیلِ پاکستان کے بعد ترقی پسند تحریک کے تیسرے دور کا آغاز ہوا، لیکن ترقی پسندوں کے مطابق مطلوبہ توقعات کے پورا نہ ہونے کے باعث اُن کے اشتراکی و سیاسی رویّے میں شدّت آ گئی۔ ایسے میں ایک طرف ترقی پسند تحریک بہ بانگِ دُہل ”ادب برائے انقلاب“ کا نعرہ لگاتی ہے، تو اِس کے ردِعمل میں اِسلامی اور پاکستانی ادب کا نعرہ لگایا جاتا ہے۔ اُس وقت کی صورتِ حال کا ایک ہلکا سا اشارہ پروفیسر غلام حسین ذوالفقار اِن میں الفاظ میں کرتے ہیں:

> ”تشکیک والحاد کی رَو میں بہ کر مذہب و اَخلاق کے خلاف آمادۂ پیکار ہونا، اُس دور کا ایک خاص رُجحان ہے، جس کا شکار زیادہ تر وہ نوجوان ہوے، جو اپنے تہذیبی وَرثے سے بے خبر یا بے گانہ تھے۔ انھوں نے مغرب کے لادینی افکار ہی کو ترقی پسندی اور تہذیب کی معراج سمجھ لیا۔“(۸)

اِس بڑھتے ہوے لادینی مزاج اور اشتراکی افکار کے طفیل تحریکِ ادبِ اِسلامی کا آغاز ہوا اور اس کا ایک باقاعدہ منشور ترتیب دیا گیا۔ ایسے حالات میں تین فکری گروہ سامنے آئے اور اِن کے نظریات و افکار سے قیامِ پاکستان کے بعد تین تحریکیں منظرِ عام پر آئیں:

اوّل: وہ مکتبِ فکر، جو رنگ، نسل اور وطنیت کے امتیازات سے بالاتر ہو کر اسلام کی رُوحانی اور اَخلاقی تاریخ، تعلیم اور تہذیب کو پاکستانی تہذیب کا حاصل سمجھتا تھا۔ اِن افکار سے ”اسلامی ادب کی تحریک“ نے جنم لیا۔

دوم: وہ گروہِ مفکرین، جس کے نزدیک برصغیر کی جغرافیائی اور زمینی اقدار ہی اِس قوم کی اصل تہذیب تھی؛ یوں ”ارضی ثقافتی تحریک“ پھوٹی۔

اور سوم: وہ جو پہلے اور دوسرے مکاتب کے افکار کو امتزاجی سطح پر دیکھنے کے قائل تھے، جسے ہند اسلامی تہذیب کا نام دیا جاتا ہے۔ اِس امتزاجی نظریے سے ”پاکستانی ادب کی تحریک“ نے جنم لیا۔

حال ہی چھپنے والے اپنے ایک مقالے میں ڈاکٹر عابد سیال لکھتے ہیں:

> ”یہ تینوں تحریکیں اپنے نقطۂ نظر میں ایک دوسرے سے مختلف، بلکہ مخالف ہیں، تاہم اِن کی بنیاد ایک ہی ہے، یعنی تہذیبی شناخت کا رُجحان؛ لہٰذا اِن تحریکوں کو ’تہذیبی رُجحان کی تحریکیں‘ کہا جا سکتا ہے۔“(۹)

بجا ہے کہ تھوڑے تھوڑے فکری اختلافات کے باوجود یہ تینوں تحریکیں ایک ہی بنیاد اور ماخذ سے طلوع ہوتی ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ اکثر ناقدین اِن تہذیبی تحریکوں کو بسا اوقات ایک ہی جگہ اور ایک ہی موضوع کے تحت بھی زیرِ بحث لاتے رہے ہیں، لیکن راقم کا خیال یہ ہے کہ اِن میں سے ہر تحریک علاحدہ علاحدہ مطالعے کی متقاضی ہے۔

نام سے ظاہر ہے کہ اِسلامی ادب کی تحریک کے زیرِ اثر ایسا ادب تخلیق کیا جائے، جو اپنے ماضی سے پیوستہ رہ کر شان دار مستقبل کی تعمیر میں حصّہ لے؛ ایسا ادب جو اسلامی اُصول کے تحفُّظ کا ضامن ہو اور غیر اسلامی اقدار کو رد کر دے۔ جس نظریاتی اساس پر یہ ملک حاصل کیا گیا ہے، اُسے مکمل طور پر لاگو کر سکنے کا اہل ہو اور اپنی تہذیبی شناخت کی ذمہ داری قبول کر سکے اور نتیجتاً ایسا ادب بہ رُوے کار لایا جا سکے، جو: ادب برائے زندگی، زندگی برائے بندگی، اور زندگی، بے بندگی، شرمندگی کا رمز شناس ہو۔ یوں اشتراکیت، فاشی، بے راہ روی، عریانی اور دیگر اَخلاقی برائیاں ہدفِ تنقید بنتی چلی گئیں۔ کئی ایک مقامات پر اس کی ذیلی شاخیں قائم ہوئیں اور ہفتہ وار اجلاس بھی منعقد ہوے، جن میں اُردُو ادب کی ہر صنف کو اِسلامی افکار سے ہم آہنگ کرنے کے مسئلے، زیرِ بحث آے: ''اُدبا کو شعوری طور پر متوجہ کرایا گیا کہ وہ اسلام کی روشن تعلیمات کو ادب پاروں کا جز بنانے کی سعی کریں۔''(۱۰) اِس مقصدیت کو واضح کرتے ہوے اَسرار اَحمد سہاروی نے لکھا کہ:

> ''اِسلامی اَدب وہ اَدب ہے، جو عام انسانی جذبات وحسیات کو اصل فطری رنگ میں اِس انداز میں سامنے لاے کہ وہ ایک صالح زندگی کی تعمیر میں مدد دینے والے ہوں۔ ہم نے اسلامی شعر و ادب کے لیے جو اساسی کلمہ مرتب کیا ہے، وہ یہ ہے: ''ایک خدا، ایک انسان، ایک نظام۔''(۱۱)

یہی وجہ ہے کہ اسے تبلیغی ادب، صالح ادب، مقصدی ادب اور جائز ادب وغیرہ کے ناموں سے بھی یاد کیا گیا۔ تحریکِ اَدبِ اسلامی پر سیّد ابو اعلیٰ مودودی کی تعلیمات ونظریات کا بنیادی اثر تھا۔ ''اسلامی نظریۂ ادب'' میں وہ لکھتے ہیں:

> ''میرے ذہن میں ادب کا تصوُّر یہ ہے کہ وہ حسنِ کلام اور تاثیرِ کلام کا نام ہے، جو چیز ادب کو عام انسانی گفتگو سے ممیز کرتی ہے، وہ کلام کا حسن اور تاثیر ہے۔''(۱۲)

نیز یہ کہ ادب کو معاش کا ذریعہ نہ بنایا جائے، نیز حسن وتاثیرِ کلام ہی اس کی بنیادی شرائط ہیں؛ یعنی بے لوث اور مخلصانہ ادب کی ترویج واشاعت تبھی ممکن ہے، جب معاش آڑے نہ آے۔ اِسی باعث اقبال کو اس تحریک میں بڑی اہمیت حاصل ہے کہ اُن کا سارا علمی اثاثہ اِسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے؛ اسی طرح سے محمد علی جوہر، اصغر گونڈوی، اسد ملتانی، ماہر القادری، عبدالکریم ثمر، اثر صہبائی، آبا دشاہ پوری، یعقوب طاہر، ملک عزیز، عبدالعزیز خالد اور پروفیسر فروغ اَحمد وغیرہ (نئے اور پرانے) اِسلامی اَدبی شاعر تصوُّر کیے جاتے ہیں اور اِن کی اہمیت بلاشبہ اِس حوالے سے واضح ہے؛ تاہم اِن شعرا کے کلام میں اسلامی افکار اور مسلمانی مزاج کے باعث گھن گرج زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ یقینی بات ہے کہ اقبال کا تتبُّع وتقلید اِن شعرا کے اُسلوب کا نمایاں وصف قرار پایا۔ درج بالا شعرا کا ذکر

ڈاکٹر انور سدید نے ''اُردو ادب کی تحریکیں'' میں کیا ہے۔ ڈاکٹر معین الدّین عقیل نے اپنی کتاب: ''تحریکِ آزادی میں اُردو کا حصہ'' میں درج بالا شاعروں کے علاوہ کئی ایسے شاعروں کا ذکر کیا ہے، جنھوں نے پاکستانیت اور اسلامی تصوّر کی حمایت میں شاعری کی؛ مثلاً نشتر جالندھری، محمود اسرائیلی، عارف سیالکوٹی، اقبال حسین رمزالہ آبادی، میاں بشیر احمد، کوثر امروہوی وغیرہ متعدد شعرا کا حوالہ اور اُن کے اشعار کی مثالیں دی گئی ہیں۔ اِس سلسلے میں ڈاکٹر معین الدّین عقیل مزید لکھتے ہیں:

> ''اِن کے علاوہ لاتعداد ایسے غیر معروف شاعروں نے اپنے جذبات وتصوّرات کو شاعری میں پیش کیا، جو پاکستان سے متعلق تھے۔ اسے شاعروں نے کانگریس اور ہندوؤں کے مقاصد کی مخالفت ''میں'' بھی ''استعمال'' کیا اور مسلمانوں کی علاحدہ قومیت کو بھی اجاگر کیا۔''(۱۲)

کچھ شعرا ایسے بھی ہیں، جن کا ذکر یہاں نہیں کیا گیا، جس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ تب یہ شعرا اِس قدر منظرِ عام پر نہ آئے تھے اور اِنھوں نے شہرت کی منازل بعد میں طے کیں؛ لیکن ایک ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر معین الدّین عقیل کی کُتب ہی پر کیا موقوف ہے، اِن شعرا کا کسی اور نقاد نے بھی اِس حوالے سے یا مجموعی طور پر بالتصریح ذکر نہیں کیا۔ اِن شعرا میں رشک ترابی، صوفی فقیر محمد فقیر، مولانا اخگر سرحدی، اقبال محمد صوفی نقوی(۱۳) اور قاضی عزیز احمد عزیز وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ قاضی عزیز احمد عزیز نے اسلام اور سائنس کے حوالے سے کئی پُرمغز مقالے بھی تحریر کیے ہیں؛ اسی طرح رشک ترابی تو نعت، قصیدہ، سلام اور مرثیہ نگاری میں بھی مقبول ہوے، تاہم اُن کی غزل میں بھی ایسے ہی افکار جھلکتے ہیں؛ مثلاً:

میں نکلا جھاڑ کے جنت سے اِس لیے دامن
کہ اُس میں رکھا ہی کیا تھا مرے سوا میرا
بس ایک بجلی سی آئی پھر اس کے بعد مجھے
فریب دے گیا برسوں کا آشنا میرا

تاہم رشک ترابی پر علامہ محمد اقبال کے اُسلوب کا غلبہ نمایاں ہے، جب کہ صوفی فقیر محمد فقیر پر یہ غلبہ کم تر ہے۔ تحریکِ ادبِ اِسلامی کے کچھ معروف شاعروں کے چند شعر مثال کے لیے ملاحظہ فرمایئے، جن سے اِس تحریک کے بنیادی مزاج کی تفہیم میں آسانی مہیا ہوتی ہے:

خدا رسول تو مانا نہیں اُنھیں ہم نے
ذرا وہ حکم چلانے میں احتیاط کریں
[نعیم صدیقی]

یہ سود و زیاں کے پیمانے، یہ جھوٹے سچے افسانے
اِن اہلِ ہوس کی باتوں سے بدنام محبت ہوتی ہے
[ماہر القادری]

مَیں حرفِ دُعا کا سلسلہ ہوں
عالَم کی نجات چاہتا ہوں

[عارف عبدالمتین]

کمالِ آدمیت منحصر ہے حسنِ سیرت پر
کہ معیارِ شرف سرمایہ داری ہے نہ مزدوری

[اسد ملتانی]

کمال جس کو سمجھتی ہے دانشِ حاضر
زوالِ حضرتِ انساں ہے قُم باذنِ اللہ

[یعقوب طاہر]

علی گڑھ تحریک کے شعرا کی طرح تو نہیں لیکن اُس سے ذرا کم، اِسلامی ادب کی تحریک کے شاعروں کے ہاں بھی غزل کی لطافت سے زیادہ اَخلاقی اقدار کی تبلیغ پر توجہ مقصد بن کر سامنے آئی۔ لہٰذا یہ شعرا کسی بڑے درجے کی غزل اور جدید نظم تخلیق کرنے میں بہت حد تک ناکام رہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ: ''ناقدین کی اکثریت اِن لکھنے والوں کو اوّل درجے کے لکھاریوں میں شامل نہیں کرتی۔''(۱۵)

آگے چل کر پروفیسر ڈاکٹر ساجد امجد نے بھی اپنی کتاب : اُردُو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات'' میں اِسلامی ادب کی تحریک کے حوالے سے کچھ سطور قلم بند کی ہیں اور ایسے شاعروں کے حوالے بھی دیے ہیں، اہم بات یہ ہے کہ اُنھوں نے اِسلامی اقدار کے اثرات موجودہ عہد کی شاعری سے بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ اُنھوں نے ایک جگہ پر ن م راشد کے الفاظ بھی اِس ضمن میں نقل کیے ہیں، جو بہت اہم ہیں:

''پاکستان کی اکثریت اسلام کی پیرو ہے۔ اسلام، اِس کے مختلف حصوں اور طبقوں کے درمیان سب سے قوی رابطہ ہے اور اسلام ہی اس کی ہستی کا بڑی حد تک جواز ہے۔ اس ملک نے ایک قومی تہذیب ورثہ میں پائی ہے، جو عرب، ایرانی اور مقامی تہذیبی اجزا کی آمیزش سے وجود میں آئی تھی اور یہ سب اجزا حسبِ توفیق اسلام کے اخلاقی اور روحانی عناصر سے متاثر ہوے تھے۔''(۱۶)

جیسا کہ ذکر ہوا کہ اِسلامی ادب کی تحریک کے پس منظر میں سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کی تعلیمات، بہت بڑا تخلیقی محرک ثابت ہوئیں۔ یہ تعلیمات، تحریک کے لیے قوت کا سرچشمہ بھی تھیں اور انھی کی روشنی میں نعیم صدیقی، ابنِ فرید، پروفیسر ہارون الرشید، پروفیسر اَسرار اَحمد سہاروی، نجات اللہ صدیقی، نجمُ الاسلام، فروغ اَحمد، اسعد گیلانی اور خورشید اَحمد نے معیاری اور فکری ادب تخلیق کیا۔ ڈاکٹر انور سدید نے اِس ضمن میں لکھا ہے:

''نعیم صدیقی نے ادبِ اسلامی کے نقطۂ نظر کو فلسفیانہ سطح پر پیش کیا۔ اُن کا ''نظریہ فوائد''

معنویت کے اعتبار سے فکری انقلاب کا نقیب ہے ..... اسی فرید کا محبوب موضوع نفسیات ہے، انھوں نے اس علم کی رُو سے اسلام کے صحت مند عناصر کی سائنسی توجیہ پیش کی۔ نجات اللہ صدیقی نے ادب کے فکری ماخذات قرآن و حدیث سے دریافت کیے۔ نجم الاسلام نے اسلام کی بنیادی تعلیمات سے اسلامی ادب کا تعمیری رویہ متعین کرنے کی سعی کی۔ فروغ احمد، اسعد گیلانی اور خورشید احمد نے اسلامی ادب کو نسبتاً وسیع تناظر میں پرکھنے کی سعی کی۔''(۱۷)

پروفیسر ہارون الرشید کی کتاب: **اُردو ادب اور اسلام** (دو جلدیں) اور پروفیسر اسرار احمد سہاروی کی **اعجاز بیاں** بڑی اہم اسلامی ادبی تصانیف شمار ہوتی ہیں۔ اسی طرح فروغ احمد کا ''اسلامی ادب کی تحریک'' اہم مقالہ شمار کیا گیا ہے؛ مزید برآں ابنِ فرید، نجم الاسلام، اسعد گیلانی اور نعیم صدیقی اس تحریک کے زیرِ اثر نمایندہ ناقدین کی حیثیت سے سامنے آے اور ان کی خدمات یقیناً لائقِ تحسین بھی ہیں۔ یہ ناقدین اپنی شخصیات کے اعتبار سے پختہ فکر تھے، لہٰذا ان کی ناقدانہ رسائی بھی پختگی کی حامل ہے، لیکن اسلامی نظریات و تعلیمات کی جا و بے جا شمولیت کے اصرار نے ایک ایسی جذباتی صورتِ حال پیدا کردی، جس سے اسلامی ادبی نقد و نظر کے فروغ و ارتقا کو صدمہ پہنچا۔

اسلامی ادبی تحریک کے تحت جو افسانہ نگار اُبھرے، اُن میں نعیم صدیقی، محمود فاروقی، اسعد گیلانی، جیلانی بی اے، فضل من اللہ، قیصر قصری، آغا میرزا، لالۂ صحرائی اور ابو الخطیب وغیرہ شامل ہیں۔ یہ فہرست ڈاکٹر انور سدید نے درج کی ہے، تاہم اس فہرست میں راقم ایک اور نام کا اضافہ کرنا چاہتا ہے اور وہ خالد اختر افغانی کا ہے؛ جن کا ایک ناولٹ: ''ملاقات'' سہ ماہی: ''شبیہ'' خوشاب (۲۰۰۴ء۔ ۲۰۰۵ء) میں پہلی بار، یک جا شکل میں شائع ہوا۔(۱۸)، علاوہ ازیں خالد اختر افغانی کے متعدد افسانے ہفت روزہ ''طارق'' بمبئی میں شائع ہوتے رہے، ان کا زیادہ جھکاؤ پاکستانی ادب کی تحریک کی طرف دکھائی ہے۔(۱۹)۔ بہ ہر حال مجموعی طور پر یہ سب افسانہ نگار اپنی افسانوی تخلیقی حیثیت سے ادب میں بہت زیادہ جگہ نہیں بنا سکے اور ادب کے عام قارئین اب ان ناموں سے پوری طرح واقفیت بھی نہیں رکھتے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اسلامی ادب کی تحریک کے تحت ان کے افسانے مقصدیت کے پرچار اور تبلیغ کے رنگ میں ڈھلتے چلے گئے اور کوئی دیرپا اثر نہ چھوڑ سکے۔ ڈاکٹر انور سدید اسلامی افسانہ نگاری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اس تحریک کے افسانہ نگاروں پر نظریے کی چھاپ اس قدر غالب ہے کہ وہ صورتِ واقعہ کو فطری طور پر اُبھارنے کے بجاے اُسے جبراً نظریے کے مقصودُ العین کی طرف موڑ دیتے ہیں اور کردار اپنی شخصیت کو اجاگر کرنے کے لیے نصبُ العین کی حمایت میں تقریریں کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں ..... چناں چہ اس تحریک نے اُردو افسانے میں کوئی قابلِ ذکر اضافہ نہیں کیا۔''(۲۰)

ڈاکٹر صاحب کی بات اپنی جگہ درست ہے، تاہم قابلِ قدر اضافہ نہ بھی کیا ہو، لیکن پھر بھی رُجحان سازی کے اعتبار سے اِنھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

نسیم حجازی، ایم اسلم، فضل احمد کریم فضلی، اسعد گیلانی، رئیس احمد جعفری اور ابوالخطیب تحریک ادبِ اسلامی کے نمایندہ ناول نگار ہیں۔ پروفیسر غفور شاہ قاسم رقم طراز ہیں:

> ''ناول اور افسانہ نگاری کے میدان میں نمایاں تخلیق کاروں میں نسیم حجازی، ایم اسلم، اسعد گیلانی، محمود فاروقی، ابوالخطیب، آغا مرزا، طاہر نقوی، امجد طفیل، اِن میں سے بیش تر فکشن کے فن میں اپنا انفرادی مقام حاصل کر چکے ہیں۔''(۲۱)

تحریک ادبِ اسلامی کے تحت نسیم حجازی کا نام نہایت اہم ہے۔ ناول نگاری کی تاریخ میں سے اُن کا نام قلم زد نہیں کیا جاسکتا۔ نسیم حجازی کا نام بلاشبہ اِسلامی ناول نگاری میں معتبر اور کام موقر ہے۔ ''آخری چٹان''، ''اندھیری رات کے مسافر''، ''یوسُف بن تاشفین''، معظم علی، ''آخری معرکہ''، ''شاہین''، ''اور تلوار ٹوٹ گئی''، ''کلیسا اور آگ''، ''محمد بن قاسم'' اور ''داستانِ مجاہد'' ان کے معروف ناولوں میں شمار ہوتے ہیں؛ تاہم یہ فہرست نامکمل ہے۔(۲۲)

اگر اِسلامی اور پاکستانی ادب کے تحت ناول نگاری کا جائزہ لیا جائے، تو کئی اہم ناول نگار سامنے آتے ہیں؛ جن میں عبداللہ حسین، فضل احمد کریم فضلی، شوکت صدیقی، عزیز اَحمد، سلیم اختر، ممتاز مفتی، رشیدہ رضیہ، نثار عزیز بٹ، سیّد شبیر حسین، غلام الثقلین نقوی، انتظار حُسین، خدیجہ مستور، رحیم گل اور مُستحصر حُسین تارڑ وغیرہ کے نام ناقدین نے تخصیص کے ساتھ گنوائے ہیں؛ لیکن عوامی شہرت کے اعتبار سے نسیم حجازی کا بھی کوئی مقابل نہیں۔

نسیم حجازی کو اگرچہ ادبی سطح پر بہت زیادہ نہیں سراہا گیا، لیکن اِس میں کوئی شک نہیں کہ عوام نے اُنھیں دِل کھول کر شرفِ قبولیت بخشا۔ تحریکِ ادبِ اسلامی کے تحت وہ ایک بڑے ناول نگار کے طور پر اُبھرے۔ اُنھوں نے اِسلامی تہذیب و تمدُّن کو اپنے ناولوں میں سمونے کی کام یاب کوشش کی۔ محض تاریخ کے مطالعے سے بہت سے لوگوں کو دل چسپی نہیں ہوا کرتی، نسیم حجازی نے کہانی کے روپ میں تاریخی واقعات ایسے اُسلوب میں بیان کیے ہیں کہ تاریخ سے دل چسپی نہ رکھنے والوں کے لیے بھی رغبت کا سامان مہیا کر دیا اور پذیرائی بھی سمیٹ لی۔ نسیم حجازی خود لکھتے ہیں:

> ''مَیں بہ ذاتِ خود تاریخِ اسلام کا کوئی اور ورق الٹتا، لیکن جن حضرات نے مجھے ''داستانِ مجاہد'' کی طرز کے ناول لکھنے کی ترغیب دی، اُن میں سے اکثر کا پہلا مطالبہ یہ تھا کہ مَیں محمد بن قاسم کے متعلق ضرور لکھوں۔''(۲۳)

اِس سے بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ عوام کی سطح پر اُن کی مقبولیت کا گراف کس قدر بلند رہا ہے اور بلا مبالغہ آج بھی نسیم حجازی کی مقبولیت اور پسندیدگی کا یہی عالَم ہے۔ بہ ہر حال اسلامی تاریخی واقعات کا گراں قدر سرمایہ اِن ناولوں میں محفوظ ہے۔ اگرچہ حسن و عشق کے کئی ایک پہلو بھی ان کہانیوں میں موجود ہیں، لیکن اس کے باوجود

واقعات اور کرداروں کا وقار مجروح نہیں ہونے پاتا اور یہ یقیناً بڑے کمال کی بات ہے۔ اسلامی طرز کے تاریخی ناول لکھ کر نسیم حجازی نے عبدالحلیم شرر اور علّامہ راشد الخیری کی یاد بجا طور پر تازہ کر دی۔ اُنھوں نے اِس روایت کو نہ صرف زندہ رکھا، بلکہ اسے آگے بھی بڑھایا۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ نسیم حجازی ناولوں کی تخلیق کے دوران میں کچھ خامیاں اور غلطیاں بھی کر گئے۔ اُن کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اُنھوں نے تاریخِ اسلامی کو کہانی کا موضوع بناتے ہوئے اعداد و شمار کا صحیح صحیح خیال نہیں رکھا اور کئی مقامات پر تاریخی حقائق سے رُوگردانی کی ہے؛ پھر اس کے ساتھ ساتھ جو رُومانی واقعات اُن کی کہانیوں میں شامل ہوئے، وہ بھی تشکیک کی فضا پیدا کرتے ہیں اور تیسری بات یہ کہ اُنھوں نے اکثر مقامات پر تبلیغ و اصلاح کا لبادہ اوڑھ لیا اور تحریکِ ادبِ اسلامی کی مقصدیت اُن پر غالب آ گئی؛ لیکن اِس کے باوجود اُنھوں نے کئی ایک سیاسی و سماجی اور نفسیاتی موضوعات پر بھی بحث کی ہے، تقسیمِ ہندوستان کو بھی موضوع بنایا ہے؛ اِس لیے یہ کہنا پڑتا ہے کہ اسلامی تاریخی ناول نگاری میں اُن کا اِس عہد میں بھی کوئی حریف پیدا نہیں ہو سکا۔ پروفیسر طاہر اقبال خان لکھتے ہیں:

> ''اسلامی اقدار کے احیا اور اسلامی ادب کی ترویج کے لیے حسن عسکری نے اپنے کالم ''جھلکیاں'' میں اس پر خاصی پُر مغز بحث کی اور اس کی حمایت کی .....شاعری کے علاوہ اِسلامی ناولوں کا رواج ہوا۔ نسیم حجازی اور رئیس احمد جعفری کی خدمات اس سلسلے میں قابلِ تحسین ہیں .....ان ناولوں پر فن سے زیادہ مقصدیت کی چھاپ ہے ..... اِسلامی ادب لکھنے والوں کے ہاں ایک وسیع و عریض کلاسیکی پس منظر پہلے سے موجود تھا اور اس کا بوجھ اُن کے فکر و شعور پر اس قدر تھا کہ نئے مسائل سے نمٹنے کے لیے فکشن کی جدید تر تکنیک اپنانا اُن کے لیے آسان نہ تھا، لیکن یہ سب کچھ پُر خلوص تھا۔''(۴۳)

اِس خلوص کا اظہار تو اُس راے سے بھی ہوتا ہے، جو ڈاکٹر محمد عزیز نے موجودہ تحریکِ ادبِ اِسلامی کے پلیٹ فارم سے دی اور جس کا ذکر آیندہ صفحات میں کیا گیا ہے۔ درحقیقت معاملہ فکر و فن کی عدم مطابقت اور عدم توازن کا ہے۔ نئے تقاضوں کے لیے ضروری تھا کہ نئی تکنیکوں کا استعمال بھی کیا جاتا۔ بہ ہر حال عصری شعور کے اظہار اور ناول کے تعیُّن کے سلسلے میں احسان اکبر اپنے ایک مقالے میں لکھتے ہیں:

> ''عبدالحلیم شرر سے لے کر راشد الخیری، منشی امراؤ علی، رشید اختر ندوی، قیسی رام پوری، رئیس احمد جعفری، ایم اسلم اور نسیم حجازی تک ہمارے ہاں تاریخ پر مبنی یا اس سے متعلق ناول لکھنے کا ایک طویل سلسلہ ملتا ہے، جو آج تک جاری ہے۔ یہاں وہ ناول بھی سامنے آتے ہیں، جنھوں نے ظہورِ پاکستان کے موقع پر ہونے والی تقسیم اور فسادات کو اپنا موضوع بنایا .....ایسے ناولوں میں رئیس احمد جعفری کا ''مجاہد''، قیسی رام پوری کا ''خون''، نسیم حجازی کا ''خاک اور خون''، ایم اسلم کا ''رقصِ ابلیس'' اور قدرت اللہ شہاب کا ''یاخدا'' سامنے آتے ہیں .....ظہورِ مملکت کو

> موضوع بنانے والے یہ تاریخی ناول نگار بھی ادب کے چھوٹے چھوٹے کارکن ہیں، جن میں نسیم حجازی اس حوالے سے بہت اہم ہیں کہ تنقیدِ ادب نے اُن کا فنی استحسان کیا یا نہیں کیا، وہ اس محاذ پر خاموشی کے ساتھ اپنے سحر آفریں قلم سے نوجوانوں کی کئی نسلوں کو متاثر کرتے رہے۔(۱۵)

طنز و مزاح نگاروں میں ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریابادی، قاضی عبدالغفار اور نعیم صدیقی اہم ہیں، جب کہ ڈراما نگاری کی ذیل میں اُحمد حسین انصاری اور نجم الاسلام قابلِ ذکر خیال کیے جاتے ہیں اور سفر نامہ نگاروں کے ضمن میں ماہرالقادری، نعیم صدیقی، شورش کاشمیری، ممتاز مفتی، وحیدہ نسیم وغیرہ کے نام گنوائے گئے ہیں۔

سب سے زیادہ قبولیت اور شہرت اِس ضمن میں "صنفِ نعت" کے حصّے میں آئی۔ نعت گوئی کے پروان چڑھنے میں اِس زمین کے خمیر کا بہت زیادہ حصہ ہے۔ اِس سارے تذکرے سے یہ اندازہ بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے کہ تحریکِ ادبِ اِسلامی کے تحت تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی گئی اور ہر صنفِ ادب کے ذریعے سے اِسلامی تعلیمات و نظریات کو اُجاگر کرنے کی سعی ہوئی۔

اِس تحریک کے نظریات کی ترویج و اشاعت کے لیے کئی ایک رسائل بھی جاری ہوئے، جن میں دہلی سے "زندگی"، لاہور سے "سیّارہ" اور "تعمیرِ انسانیت"، کراچی سے "چراغِ راہ" اور "جہانِ نو"، علی گڑھ سے "نئی نسلیں" اور میرٹھ سے "معیار" وغیرہ اہم ترین رسائل ہیں۔ اِن سے بھی تحریک کی مقبولیت کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ راقم کے خیال میں یہ اِسلامی ادبی تحریک ہی کے اثرات ہیں کہ آگے چل کر اسلامی روحانی اور اَخلاقی اقدار کی ترویج و اشاعت کے لیے "سیارہ ڈائجسٹ" نے بھی کئی ایک خاص شمارے شائع کیے، جن کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے؛ مثلاً سیارہ ڈائجسٹ کا "اولیائے کرام نمبر" تین جلدوں میں شائع ہوا۔ اسی طرح بعد میں بھی ایسے رسائل و جرائد کا ایک باقاعدہ سلسلہ دکھائی دیتا ہے، بس ضرورت یہ ہوتی ہے کہ ہم مثبت نظر ہو کر حالات و واقعات کا جائزہ لیں۔

تحریکِ ادبِ اِسلامی کی مخالفت اور حمایت میں کئی ناقدین نے قلم اُٹھایا، جو تحریک سے وابستہ نہ تھے۔ مخالفت میں فراق گورکھ پوری، علی عباس جلال پوری، سعید اُحمد رفیق، اَخلاق اُحمد دہلوی وغیرہ شامل ہیں، جب کہ حمایت میں محمد حسن عسکری، نصیر الدین ہاشمی، شوکت سبزواری، احسن فاروقی، ابو اللیث صدیقی اور ڈاکٹر آفتاب احمد خان وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر آفتاب احمد خان نے اپنی کتاب: "اشارات" میں اِسلامی ادب کے زیرِ عنوان تین تحریریں شامل کی ہیں، جن میں سے ایک تحریر فراق گورکھ پوری کے نظریات و اختلافات کے جواب میں ہے، ایک خط فراق گورکھ پوری کے نام اور ایک مدیر: "نقوش" کے نام سے ہے۔ اُنھوں نے اِن تحریروں میں اسلامی ادب کی تحریک کی بھرپور حمایت، اِس کا جواز، اثرات اور نتائج سے آگاہ کرنے کی قابلِ قدر کوشش کی ہے۔ صرف ایک جملہ یہاں پیش کیا جاتا ہے، جس سے پوری تحریر کا مزاج سمجھنے میں آسانی میسر آئے گی:

> "فراق صاحب اسلامی کلچر اور اسلامی ادب کے بارے میں پیش کردہ خیالات کے پُرزے

اڑائیں، مجھے ایک رنج نہ ہوگا؛ مگر شرط یہ ہے کہ فراق بن کر اڑائیں ..... اُن کا یہ مضمون تو عام ترقی پسند نقادوں کے سطحی نظریات اور مخصوص تعصّبات کی نذر ہو کر رہ گیا ہے۔'' (۲۶)

اِس طرح کے ردِ عمل کا اظہار اکثر ناقدین نے کیا ہے۔ محمد حسن عسکری نے ''جھلکیاں'' میں کئی مقامات پر اِس حوالے سے بحث کی اور اسلامی ادب کی تحریک کا دفاع کیا ہے۔ کچھ ناقدین ایسے ہیں، جنھوں نے اِس تحریک کی مخالفت تو نہیں کی، لیکن اُنھوں نے اِس کے طریقِ کار اور اُسلوب پر کڑی تنقید کی اور بعض اوقات تو شدید طنزیہ رویہ بھی اپنا لیا ہے، البتہ اُن کے خلوص پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ اِس ضمن میں سلیم احمد کا نام خاص طور پر اہم ہے۔ اُن کی آرا آیندہ صفحات میں نقل کی گئی ہیں۔

درج بالا صفحات میں ''تحریکِ ادبِ اسلامی'' کے محرکات، پس منظر، اسلامی نقطۂ نظر، اسلامی شاعری، افسانہ، طنز و مزاح، تنقید اور پھر اِسلامی اور اسلامی تاریخی ناول نگاری کے ضمن میں نسیم حجازی کا بہ طورِ خاص ذکر کیا گیا ہے۔ اصل متن سے کچھ مثالیں بھی درج کی گئی ہیں اور تحریک کے منشور کی تفہیم کے لیے کچھ اقتباسات بھی پیش کیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اِسلامی ادبی تحریک پر دیگر ناقدین کی تنقیدی آرا بھی درج کی گئی ہیں۔ اِس تمام تر بحث کا مقصد درحقیقت یہ واضح کرنا ہے کہ اِسلامی ادب اور نقد و نظر سے اُردو ادب کو ایک نئے نظریے سے شناسائی کا موقع ضرور ملا۔ اُردو ادب کا تخلیقی دامن وسیع ہوا۔ بہ عینہٖ انتقادِ ادبیاتِ اُردو کے طریقِ کار میں مثبت تبدیلیاں بھی رُونما ہوئیں اور کسی فن پارے کا تجزیہ کرنے کے لیے خارجی محرکات اور موضوعاتی جائزے، داخلی عناصر، وجدانی کیفیات، تخلیقی وفور اور زبان و بیان کے لطف و صحت کو بھی پیشِ نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ بنیادی توجہ اِسلامی اقدار و ضوابط پر دی گئی اور بلاشبہ اِس اُسلوبِ نقد کے اثرات یقیناً اُردو تنقید پر دکھائی دیتے ہیں۔ یقینی بات ہے کہ اِس اُسلوب کے ذریعے سے کچھ خامیاں بھی شاملِ کار ہوئیں، جن میں ایک خاص نقطۂ نظر کی شدّت، اِسلامی آداب و اُصول کی کثرت، بعض اوقات دیگر تخلیقی عناصر کی کمی یا نفی کا رُجحان، کہیں کہیں عقلی و سائنسی اور نفسیاتی اندازِ فکر کی کمی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں، تاہم مجموعی طور پر اِسلامی ادبی تحریک کے اثرات سے سوچنے، سمجھنے اور تفہیم و تدریس و ترسیل کی نئی جہتیں بھی سامنے آئیں اور اِس کے اثرات آیندہ نثر نگاروں تک بھی منتقل ہوے۔ اِس لحاظ سے اگر یہ کہا جاے کہ یہ تحریک بھی اپنے نقطۂ نظر کے ابلاغ میں یقیناً کام یاب رہی، تو کچھ غلط نہ ہوگا۔

لیکن ہوا یہ کہ تحریکِ ادبِ اِسلامی کے تحت یہ لوگ بھی عدمِ توازن کا شکار ہوے۔ اِن کی تحریروں میں بھی انتہا پسندی کے عناصر سطح پر آنے لگے۔ یہ بات تو اِسلام نے واضح طور پر بتا دی کہ ''لا اِکراہَ فی الدّین'' یعنی: دینِ اسلام میں جبر، کراہت، یا ناگواری کا چلن نہیں ہے؛ یہی بات تحریک والوں نے نظر انداز کر دی۔ اِسلام نے جن ضابطوں اور جن پابندیوں کا ذکر کیا، اُنھیں تو بنیاد بنا لیا گیا، لیکن جہاں جہاں اِسلام نے رعایت اور گنجائش کا سامان فراہم کیا، اُن کی طرف مطلق توجہ نہ کی گئی اور اِسلام کے اُسلوب کے مطابق وہ مراعات آگے منتقل نہ کی گئیں؛ لہٰذا تحریکِ ادبِ اِسلامی کے زیرِ اثر اپنے مقاصد کی تشریح تو یقیناً میسر آتی ہے، اُس سے کہیں زیادہ ترقی پسندوں اور اشتراکیوں کی نفی کا گمان غالب آنے لگتا ہے۔ شاید انھی معاملات کے باعث تخلیق کے اصل دھارے نہ اُبھر سکے اور

کوئی قابلِ تقلید کام نہ ہوسکا، نیز ترقی پسند تحریک کے زور اور اثر کے ٹوٹنے کے ساتھ ہی اسلامی ادب کی تحریک بھی کم زور پڑ گئی۔ اکثر ناقدین کے نزدیک اِس تحریک کو ناکامی ہوئی، اِس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ ڈاکٹر محمد عزیز لکھتے ہیں :

> ''کسی بھی ادب کی قدر و قیمت کا انحصار اس کے موضوع پر ہوتا ہے۔ اِس لحاظ سے اِسلامی ادب کا گراں مایہ ہونا محتاجِ بیان نہیں، لیکن اِسلامی ادیب کو یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ وہ واعظ یا ناصح نہیں، ادیب ہے۔ اس کا کام منطقی استدلال نہیں، بلکہ مرقع کشی ہے۔ ادب بھی ایک فنی لطیف ہے .....موضوع کچھ بھی ہو، ادب میں ہیئت کے حُسن سے بے اعتنائی جائز نہیں۔''(۲۷)

اِس اثر شکنی کے حوالے سے سیّد اسعد گیلانی یوں جواز پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں:

> ''بلاشبہ پاکستان میں اِسلامی ادب کی تحریک نے جو ۱۹۴۹ء میں ایک اجتماعی حیثیت اور تنظیم کی شکل اختیار کی تھی، وہ معاشرے کے فطری رُخ کے خلاف اور ایک بالاتر سیاسی طبقہ کے دباؤ کے سبب قائم نہ رہ سکی۔''(۲۸)

اسلامی ادب کے نمایندگان پر شاید کڑی اور مثبت تنقید سلیم احمد نے کی ہے۔ اِسلامی ادب کیا ہے؟ کیسے پیش کیا گیا؟ کیسا ہونا چاہیے؟ اثرات کیا ہوے؟ وغیرہ کے حوالے سے سلیم احمد نے ایک قابلِ غور فکری مضمون : ''اسلامی زندگی مع چھ رنگین ناچوں کے'' قلم بند کیا ہے۔ صرف ایک رائے ملاحظہ فرمایئے:

> ''یہ تو بالکل ٹھیک ہے کہ پاکستان کا مقصد اسلام کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظام کا ایک ایسا تجربہ ہے، جو عہدِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو اور اس مقصد کے تحت ہمارا اوّلین فرض یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کو اسلامی بنالیں، مگر اسلامی زندگی کے معنی کیا ہیں ..... لاہور میں ایسے سر پھرے لوگ پیدا ہوے، جو بے پردہ عورتوں کی چوٹیاں کاٹنے کی تلقین کے لیے افسانے لکھتے تھے۔ کیا یہ اسلامی ادب ہے؟ ابھی مَیں نے کسی اخبار میں ایک فلم کا اشتہار دیکھا ہے : ''کفر کی طاغوتی قوتوں کو اسلام کا دندان شکن جواب، مع چھ رنگین ناچوں کے''، کیا یہ اسلامی آرٹ ہے؟ ..... اسلامی ادب اور آرٹ وہ ہے، جس میں حیات کا کوئی اُصول پیش کیا جائے۔''(۲۹)

سب جانتے ہیں کہ سلیم احمد کے اخلاص پر اِس لیے بھی شک نہیں کیا جاسکتا کہ محمد حسن عسکری کے بعد وہ پاکستانی ادب کی تحریک کے بڑے پیش رو ہیں اور پاکستانی ادب کو اسلامی نظریات سے ہٹ کر خود بھی دیکھنے کے قائل نہیں ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ اُنھوں نے ڈاکٹر وزیر آغا کی معروف کتاب: ''اُردو شاعری کا مزاج'' پر ایک اہم علمی اور اختلافی بحث پر مبنی مضمون لکھا ہے، ہمیں یہاں اُس تحریر کے نفسِ مضمون سے تو کچھ سروکار نہیں، تاہم اُس میں ایک جملہ اسلامی ادب کی تحریک کے حوالے سے بھی دیکھا جاسکتا ہے اور ہمارے درج بالا موقف کی تائید کرتا

ہے:

''مسلمانوں کی تہذیب کا کیا مستقبل ہے۔ آغا صاحب نے اِس سوال کے جواب میں سوا چار سو صفحات لکھے ہیں ..... جواب یہ ہے کہ ارضی مادری تہذیب اسلام۔''(۳۰)

اِس رائے کی روشنی میں مزید کیا کہا جا سکتا ہے۔ ایک اور جگہ پر سلیم احمد نے اپنے ہی نظریے کے لکھنے والوں کے لیے بھی سخت تنقیدی رائے دی اور درست اُصول مرتب کرنے کی سعیِ مشکور کی ہے:

''پاکستانی ادب، وہ ادب ہے، جو پاکستان کے بارے میں ہو، اِس حساب سے بہترین ادب پاکستانی گائیڈ ہے۔ ایک دوسری بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ پاکستانی ادب، وہ ادب ہے، جو پاکستان میں لکھا جائے۔''(۳۱)

دراصل اس طرح ادب کا دائرہ کار محدود ہو کر رہ جاتا ہے اور اس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے کہ پاکستانی ادب، ادب کا ایک منفرد زاویہ اور ایک جداگانہ رویّہ ہے۔ ایسی ہی ایک رائے پروفیسر جیلانی کامران نے بھی دی ہے؛ وہ لکھتے ہیں:

''پاکستانی ادب رویّے کا نام ہے؛ ادب کا نام نہیں ہے۔ کسی قوم اور کسی تہذیب کا اعلیٰ ادب اثباتی ہوتا ہے۔ پاکستانی کہنے سے پاکستان کی شناخت ظاہر نہیں ہوتی۔''(۳۲)

اب جہاں جہاں لفظ پاکستانی آیا ہے وہاں وہاں اسے لفظِ اسلامی سے بدل کر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

تاہم اسلامی ادب کی تحریک کا بے لاگ جائزہ لینے، منصفانہ تبصرہ کرنے، اِس کے اثرات و نتائج کی طرف اشارہ کرنے والوں میں ڈاکٹر انور سدید کا اہم حصہ ہے، وہ تحریکات سے متعلق اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''ایک مضبوط نظریاتی اساس کی موجودگی کے باوصف یہ تحریک تخلیقی سطح پر کوئی معرکہ آرا کارنامہ انجام نہ دے سکی ..... نتیجہ یہ ہوا کہ تحریکِ ادبِ اسلامی نے فرد کو داخلی طور پر متحرک کرنے کے بجائے خارجی سطح پر متحرک کرنے کی سعی کی ..... چناں چہ یہ کہنا درست ہے کہ تحریکِ ادبِ اسلامی کی تنقید نظریاتی اعتبار سے کافی پختہ ہے، لیکن اس کی عملی تنقید بے حد کم زور ہے اور مضبوط نظریات کا اطلاق کم زور تخلیقات پر کیا گیا، تو اس تحریک کے تنقیدی فیصلوں کو دوامِ قبول حاصل نہ ہو سکا ..... نتیجہ یہ ہوا کہ کسی ایک صنف میں بھی انفرادیت کا نقش پیدا نہ ہو سکا ..... اہم بات یہ ہے کہ اِس تحریک نے ادب کی مقصدیت کو تو تسلیم کیا، لیکن ادب کے بالواسطہ تخلیقی عمل کو قبول نہیں کیا۔''(۳۳)

اُس دور کی عمومی شاعری کے حوالے سے ایک رائے پروفیسر ڈاکٹر ساجد امجد نے پیش کی ہے، جس سے اسلامی ادب کی تحریک کے نتائج اور اثرات کا جائزہ لیا جا سکتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''اسلامی اقدار بالکل اصلی شکل میں نہ معاشرے میں تھیں، نہ ادیبوں میں؛ لہٰذا شاعری میں اس کی بہتات تو نہیں، لیکن ان اقدار کا جس قدر حصہ معاشرہ میں، اس کا معتد بہ حصہ اس دور کی

شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔"(۲۴)

دیگر کئی ناقدین کی طرح راقم، اسلامی ادب کی تحریک کو ناکام خیال نہیں کرتا۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ زیرِ بحث تحریک کے علاوہ، گزشتہ تحاریک میں سے اور کون سی ایسی تحریک ہے، جس کا وجود اپنے ہی عہدِ کمال کی طرح قائم و دائم ہے۔ "کلُّ مَن علیھا فان۔" یعنی: ہر شے فنا ہو جانے والی ہے۔ (الرحمٰن)۔ اصل بات کسی تحریک کے اثرات ہیں، جن کی بہ دولت اُس تحریک کی کام یابی یا ناکامی کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ تحریکِ ادبِ اسلامی، ایک تحریک کی حیثیت سے تو اب ماضی کی طرح پُر جوش نہیں رہی اور نہ یہ تحریک اب منظم یا باقاعدہ تنظیم کی صورت میں موجود ہے؛ البتہ نظریاتی سطح پر اس کا وجود قائم ہے اور اس اسلامی سرزمین پر اس کا اثر و رسوخ ہمیشہ ہی رہنے والا ہے۔ راقم کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ پاکستان کی غالب اکثریت مذہبِ اسلام کی پیروکار ہے، ہم جس بھی درجے کے مسلمان ہیں، ہیں تو مسلمان۔ لہٰذا یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ پاکستانی ادیب، شاعر، نقاد، محقق جب بھی کچھ لکھے گا، اپنی اسلامی اقدار اور مذہبی عقاید سے چاہتے ہوئے بھی رُوگردانی نہیں کر سکتا، کیوں کہ یہ سب کچھ اُس کے خون میں شامل ہے اور اِن اقدار کے وراثتی اثرات دو چار نسلوں کی بات نہیں، بلکہ نسل در نسل پیچھے کی طرف پھیلے ہوئے ہیں اور اسلامی عقاید و نظریات کی روایت کئی سو سال پرانی ہے۔ اِس لیے پاکستان میں جب کوئی مسلمان ادیب یا شاعر جو کچھ بھی لکھے گا، وہ اسلامی اقدار سے کہیں نہ کہیں ضرور عبارت ہوگا؛ مثلاً ثقافت، فوک ویز، (Folk Ways) تہذیب اور مذہب کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی اسی انداز اور نقطۂ نظر کے ساتھ گفتگو کی ہے، جو ہمارے نقطۂ نظر کی تائید بھی کرتی ہے:

> "ظاہر ہے کہ ریگستان میں رہنے والوں کے فوک ویز، پہاڑوں اور میدانوں میں رہنے والوں کے فوک ویز سے مختلف ہوں گے، لیکن اِن پر بھی ہمارے مذہب کی رُوح اور ہمارے عقائد و ایمان کی گہری چھاپ موجود ہے، مثلاً کسی بھی علاقے کی عورتوں میں ایسا لباس نہیں ملے گا، جو اسلام کے تصوّرِ حیا کے منافی ہو؛ کوئی کھانا ایسا نہیں ملے گا، جو حلال و حرام کے اسلامی تصوّر کے خلاف ہو؛ ہر علاقے کی عبادت گاہوں کا رُخ کعبے کی سمت ہوگا ..... بچہ پیدا ہوگا تو کان میں اذان ضرور دی جائے گی؛ کفن دفن کا بنیادی طریقہ بھی ایک ہوگا؛ اذان کی آواز سُن کر ہر علاقے کی عورتیں اپنا سر ڈھانپ لیں گی ..... فوک ویز کی جغرافیائی اور رسمی اہمیت ہے، لیکن اِن کو وجود میں لانے اور یہ صورت عطا کرنے والی "رُوح" سب علاقوں میں ایک اور مشترک ہے اور قومی تشخص اور قومی ثقافت کی تلاش میں ہمیں اسی "رُوح" کو اہمیت دینی چاہیے۔"(۲۵)

اسی طرح ایک اور مضمون: "ادب، نظریہ اور مملکت" میں بھی ڈاکٹر جمیل جالبی نے اِس نقطۂ نظر کی تشریح کی کوشش کی ہے کہ:

> "ادب کا کام، نظامِ فکر جس کا حصہ ہے، یہ بھی ہے کہ وہ نظریہ اور مملکت کے رشتے کا بار بار جائزہ لیتا رہے، تاکہ ثبات و تغیّر کے نظام پر نظر ثانی ہوتی رہے اور مملکت، آنے جانے والی چیز

(جس کا نام حکومت ہے) کے اثر سے کسی غلط سمت میں نہ چلی جائے..... ہم خود اپنا اپنا فکری نظام نہیں بنائیں گے، تو آیندہ صدی تک ہم کلمہ گو تو شاید رہ جائیں گے، لیکن ساتھ ساتھ فکر مغرب میں بھی پوری طرح جذب ہو جائیں گے۔"(۳۶)

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا کہ کوئی بھی پاکستانی اپنی اسلامی اقدار اور مذہبی عقاید سے چاہتے ہوے بھی رُو گردانی نہیں کرسکتا، کیوں کہ یہ سب کچھ اُس کے خون میں شامل ہے اور اِن اقدار کے وراثتی اثرات دو چار نسلوں کی بات نہیں، بلکہ نسل در نسل پیچھے کی طرف پھیلے ہوے ہیں اور اسلامی عقاید ونظریات کی روایت سال ہا سال پرانی ہے۔ اِس لیے پاکستان میں، بلکہ پوری دُنیا میں جب بھی کوئی مسلمان ادیب یا شاعر جو کچھ بھی لکھے گا، وہ اسلامی اقدار سے کہیں نہ کہیں ضرور عبارت ہوگا؛ مثلاً ن م راشد جیسا باغیانہ (مجتہدانہ؟) افکار کا حامل شاعر بھی تلمیحات، اِسلام ہی کے دامنِ علم سے مستعار لیتا ہے۔ چاہے وہ "ابولہب کی شادی" نظم ہو، یا "اسرافیل کی موت" ہو۔ اِسی طرح با نوقدسیہ کا مشہورِ زمانہ ناول "راجہ گدھ" اپنے جدید اندازِ فکر وتحریر کے ساتھ اسلامی اقدار اور حلال وحرام کے فلسفے کا داعی ہے۔ حمدیہ، نعتیہ اور صوفیانہ شاعری کی تو بحث ہی الگ ہے؛ یہاں تو سعادت حسن منٹو جیسا ادیب بھی افسانہ نگاری کرتے ہوے اسلامی اقدار سے رُوگردانی نہیں کرسکا۔ شوکت صدیقی، عبداللہ حسین، ممتاز مفتی، انتظار حسین، مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں میں، ممتاز مفتی، غلام عباس، انتظار حسین، اشفاق احمد، احمد ندیم قاسمی، رشید امجد وغیرہ کے افسانوں میں اپنی اقدار کی جھلکیاں بہ ہر حال موجود ہیں۔ طنز ومزاح کے حوالے سے مشتاق احمد یوسفی پر کئی طرح کے اعتراض کیے گئے ہیں اور خود اسلامی تحریک کے ناقدین نے کیے ہیں (۳۷)، لیکن راقم کا نقطۂ نظر اِس ضمن میں بالکل مختلف ہے اور وہ یہ کہ مشتاق احمد یوسفی کی طنزیہ وشگفتہ نثر میں جا بہ جا اسلامی عقاید ونظریات بکھرے پڑے ہیں (۳۸)۔ اسی طرح سفرنامہ نگاری کی صنف کو لیا جاے، تو وہاں بھی یہی صورتِ حال اور ماحول دکھائی دے گا۔ چاہے وہ محمود نظامی ہوں، یا بیگم اختر ریاض الدین ہوں، ابنِ انشا ہوں، یا مستنصر حسین تارڑ ہوں، یا پھر حج کے سفرنامے لکھنے والے ادیب ہوں۔ سوانح اور آپ بیتی نگاروں میں احسان دانش ہوں، یا قدرت اللہ شہاب ہوں، سب کے ہاں خون میں رچی ہوئی اسلامی تعلیمات کی خوش بو ضرور مہکے گی۔ ہماری تنقید میں جتنے بھی اثرات مغربی ناقدین کے شامل ہو جائیں، اپنی منہ زور اسلامی تہذیبی تخلیقی کونپلیں کہیں نہ کہیں سے ضرور پھوٹ پڑتی ہیں اور اِن تنقید نگاروں میں چاہے محمد حسن عسکری ہوں، سلیم احمد ہوں، ڈاکٹر وزیر آغا ہوں، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی ہوں، آلِ احمد سرور ہوں، عبادت بریلوی ہوں، ڈاکٹر سیّد عبداللہ ہوں، ڈاکٹر جمیل جالبی ہوں، یا پھر نئی نسل کے اُبھرتے ہوے نقاد ہوں، سب کے ہاں اپنی مٹی اور عقاید کی بو باس ضرور ملے گی۔ تو پھر ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی ادب کی تحریک ناکام تحریک ہے، بلکہ اِس کے اثرات تو دائمی ہیں، کیوں کہ اِسلام ایک ہمہ گیر اور آفاقی مذہب ہے، اِس لیے اِسلامی ادب اور اِسلامی تحریک بہ ہر حال کسی نہ کسی صورت میں اس معاشرے میں موجود ضرور رہے گی۔ اسلامی ادب کی تحریک ضرور ختم ہوگئی ہے اور اب اِس کا نعرہ یا پروپیگنڈہ نہ بھی رہے، لیکن ہمارا ادب تو ہمیشہ اسلامی ہی رہے گا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی رائے پر اپنا مقالہ مکمل کرتے ہیں:

''ایک ایسی مملکت جو اسلام کے نام پر بنی ہے، جس کا نظامِ حکومت اور نظامِ زندگی اسلام ہی کے تابع ہوسکتا ہے، وہاں کا ادب اِسلامی نہ ہوگا، تو کیا ہوگا؟ یہی لوگ کہتے ہیں کہ ادب کو زندگی کا ترجمان ہونا چاہیے؛ اسے حقیقت کی عکاسی کرنی چاہیے۔ اگر یہ سچ ہے تو پھر پاکستانی ادب اِسلامی ادب ہی ہوگا، کیوں کہ ہماری زندگی کی اساس جب اسلام ہوگا اور ہماری قدریں جب اِسلامی ہوں گی اور ہمارا ادب جن کی ترجمانی کرے گا، تو پھر اسے آپ کیا کہیں گے۔''(۳۹)

حوالہ جات وحواشی:

(۱) پریم چند، بہ حوالہ: **فنِ تنقید اور اُردو تنقید نگاری**، از: نورالحسن نقوی، ڈاکٹر، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاوس، بارِ اوّل: ۱۹۹۰ء، ص ۳۳

(۲) نجاتُ اللہ صدیقی، **اِسلامی ادب**، لکھنؤ، ادارہ ادبِ اِسلامی، ۱۹۶۳ء، ص ۷

[بہ حوالہ: **اُردو ادب کی تحریکیں**، از: انور سدید، ڈاکٹر، ص ۶۰۰]

(۳) انور سدید، ڈاکٹر، **اُردو ادب کی تحریکیں**، کراچی، انجمن ترقیِ اُردو پاکستان، اشاعت چہارم: ۱۹۹۹ء، ص ۶۰۰

(۴) حافظ محمود شیرانی، **پنجاب میں اُردو**، لکھنؤ، اُتر پردیش اُردو اکادمی، دوسرا ایڈیشن: ۱۹۹۰ء ص ۲۶

(۵) سلیم اختر، ڈاکٹر، **اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ (آغاز سے 2000ء تک)**، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص ۴۷۲

(۶) مزید تفصیل کے ملاحظہ دیکھیے: مضمون: ''عسکری صاحب کی ''جھلکیاں''''، از: سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر مشمولہ: **باتیں**، از سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر، لاہور: مینب بک ڈپو، سن: ندارد، صفحات ۴۳ تا ۴۷

(۷) محمد حسن عسکری، **تخلیقی عمل اور اُسلوب**، کراچی، نفیس اکیڈمی اُردو بازار، طبع: ۱۹۸۹ء، ص ۲۱۶

(۸) غلام حسین ذوالفقار، **اُردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر**، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء ص ۴۸۷، ۴۸۸

(۹) عابد سیال، ڈاکٹر، مضمون: ''تہذیبی رُجحان کی تین تحریکیں اور اُردو غزل''، مشمولہ: **بازیافت**، تحقیقی وتنقیدی مجلّہ، لاہور، شعبۂ اُردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی، شمارہ: ۱۲، جنوری ۲۰۰۸ء تا جون ۲۰۰۸ء، ص: ۴۷

(۱۰) انور سدید، ڈاکٹر، **اُردو ادب کی تحریکیں**، اشاعت دوم: ۱۹۹۱ء، ص: ۶۰۱

(۱۱) اسرار احمد خان سہاروی، **ادب اور اِسلامی قدریں**، کراچی، مکتبہ چراغ راہ، سن: ندارد، ص: ۵۱

(۱۲) سیّد مودودی، ابوالاعلیٰ، **اسلامی نظریۂ ادب**، لاہور، ادارہ ترجمانُ القرآن، اشاعت: ۱۹۸۸ء، ص: ۲۵

(۱۳) معین الدّین عقیل، ڈاکٹر، **تحریکِ آزادی میں اُردو کا حصہ**، لاہور، مجلس ترقیِ ادب، اشاعت اوّل: جون ۲۰۰۸ء، ص: ۳۸۸

(۱۴) سرگودھا یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو کے تحت، طارق محمود تبسّم نے **وشٹ ترابی: شخصیت اور ادبی خدمات** کے نام سے، آمنہ بتول نے **مولانا اخگر سرحدی کی ادبی خدمات** کے عنوان سے اور ساجدہ عبداللہ نے **اقبال محمد صوفی تھوی: شخصیت اور شاعری** ' کے زیرِ عنوان ایم اے کی سطح کے مقالے قلم بند کیے۔ یہ تینوں مقالے پروفیسر ڈاکٹر سیّد سجاد حسین شیرازی کی نگرانی میں ۱۹۹۷ء میں مکمل کیے گئے۔

(۱۵) عابد سیال، ڈاکٹر، مضمون: ''تہذیبی رُجحان کی تین تحریکیں اور اُردو غزل''، مشمولہ: **بازیافت**، شمارہ: ۱۲، ص: ۷۶

(۱۶) ن م راشد، بہ حوالہ: **اُردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات**، از: ساجد امجد، پروفیسر ڈاکٹر، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، سالِ اشاعت: ۲۰۰۳ء، ص: ۴۴۴، ۴۴۵

(۱۷) انور سدید، ڈاکٹر، **اُردو ادب کی تحریکیں**، ص: ۶۰۵

(۱۸) دیکھیے: **شبیہ**، خوشاب، سہ ماہی اُردو ادبی جریدہ، سلسلۂ متن کا ایک اور خاص شمارہ، ''خالد اختر افغانی کا ناولٹ: ملاقات''، تحقیق و جستجو: ظہیر باقر بلوچ، تدوین: طارق حبیب، جلد: ۱۳، ۱۴، شمارہ: ۵۱ تا ۵۴، جولائی ۲۰۰۴ء تا جون ۲۰۰۵ء، صفحات: ۸۸، مدیر: طارق حبیب یہ ناولٹ ہفت روزہ: **طارق**، بمبئی میں ۲۳ (تیئس) اقساط میں شائع ہوتا رہا، جسے بعد ازاں ایک اکائی میں پروکر **شبیہ** میں پیش کیا گیا۔

(۱۹) ہفت روزہ: **طارق** بمبئی میں یہ افسانے شائع ہوتے رہے۔ خالد اختر افغانی مذکورہ اخبار کے مدیر بھی تھے اور قائدِ اعظم کے سیکرٹری بھی رہے۔

(۲۰) انور سدید، ڈاکٹر، **اُردو ادب کی تحریکیں**، ص: ۶۰۸

(۲۱) غفور شاہ قاسم، پروفیسر، **پاکستانی ادب: ۱۹۴۷ء تا حال**، لاہور، بک ٹاک ٹمپل روڈ، اشاعت: ۱۹۹۵ء، ص: ۱۴۱

(۲۲) یہ تمام ناول قومی کتب خانہ لاہور سے مختلف اوقات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

(۲۳) نسیم حجازی، ''محمد بن قاسم''، لاہور، قومی کتب خانہ، سنِ اشاعت: ندارد، ص: ۷

(۲۴) طاہر اقبال خان، پروفیسر، مضمون: ''تحریک ادبِ اسلامی (آغاز تا حال)''، مشمولہ: **ماہ نو**، لاہور، ماہ نامہ، گولڈن جوبلی نمبر، جلد: ۵۰، شمارہ: ۸، اگست ۱۹۹۷ء، ص: ۳۶

(۲۵) احسان اکبر، مضمون: ''پاکستانی ناول، ہیئت، رُجحان اور امکان''، مشمولہ: **ماہ نو**، لاہور، گولڈن جوبلی نمبر، ص: ۱۲۱

(۲۶) آفتاب احمد، ڈاکٹر، مضمون: ''بنامِ مرشدِ ناؤک خیالاں؛ فراق صاحب کی خدمت میں چند گزارشات''، مشمولہ: **اشارات**، کراچی، مکتبہ دانیال، اشاعت اوّل: اگست ۱۹۹۶ء، ص: ۴۵

(۲۷) محمد عزیز، ڈاکٹر، مضمون، مشمولہ: **اسلامی ادب**، مرتب: نجاتُ اللہ صدیقی، لکھنؤ، ادارہ ادبِ اسلامی، اشاعت: ۱۹۶۳ء، ص: ۴۹

(۲۸) سیّد اسعد گیلانی، **اسلامی نظریۂ ادب**، مرتبہ، لاہور: ادارہ ترجمانُ القرآن، اشاعت: ۱۹۸۸ء، ص: ۲۰۷

(۲۹) سلیم احمد، مضمون: ''اسلامی زندگی مع چھ رنگین ناچوں کے''، مشمولہ: **نئی نظم اور پوراآدمی** از سلیم احمد، کراچی، نفیس اکیڈمی، اگست ۱۹۸۹ء، ص: ۲۲۰، ۲۲۲

(۳۰) سلیم احمد، مضمون: ''ارضی تہذیب کا انجام''، مشمولہ: **نئی شاعری، نامقبول شاعری** از سلیم احمد، کراچی، نفیس اکیڈمی، اگست ۱۹۸۹ء، ص: ۲۱۷، ۲۱۸

(۳۱) سلیم احمد، مضمون: ''پاکستانی ادب کا مسئلہ''، مشمولہ: **سیپ**، کراچی، ماہ نامہ، شمارہ: ۳۱، جلد: ندارد، ص: ۱۴۰

(۳۲) جیلانی کامران، پروفیسر، مصاحبہ، مشمولہ: **جنگ**، لاہور، روزنامہ، ادبی ایڈیشن، جلد: ۷، یکم جولائی ۱۹۸۶ء، ص: ۱۰

(۳۳) انور سدید، ڈاکٹر، **اُردو ادب کی تحریکیں**، ص: ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۸

(۳۴) ساجد امجد، پروفیسر ڈاکٹر، **اُردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات**، ص: ۴۴۴

(۳۵) جمیل جالبی، ڈاکٹر، مضمون: ''قومی تشخص اور ثقافت''، مشمولہ **نئی تنقید** از جمیل جالبی، ڈاکٹر، مرتبہ: خاور جمیل، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، سالِ اشاعت: ۱۹۸۸ء، ص: ۳۱۴، ۳۱۵

(۳۶) جمیل جالبی، ڈاکٹر، مضمون: ''ادب، نظریہ اور مملکت''، مشمولہ: **ادب، کلچر اور مسائل** از جمیل جالبی، ڈاکٹر، مرتبہ: خاور جمیل، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، سالِ اشاعت: ۱۹۸۸ء، ص: ۳۴۴

(۳۷) دیکھیے: ادریس صدیقی کا مضمون: ''آبِ گم''، مشمولہ: **مشتاق احمد یوسُفی؛ چراغ تلے سے آبِ گم تک**، مرتّب: طارق حبیب، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، اشاعت دوم: ستمبر ۲۰۰۶ء، صفحات: نیز دیکھیے: طیّب منیر کا مضمون: ''آبِ گم''، مشمولہ: **مشتاق احمد یوسُفی؛ چراغ تلے سے آبِ گم تک**، صفحات: ۲۵۰ تا ۲۶۰

(۳۸) دیکھیے: تحقیقی و تنقیدی کتاب: **یوسُفیات [مشتاق احمد یوسُفی؛ سوانح، فکر اور فن]**''، مصنفہ: طارق حبیب، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء نیز دیکھیے تحقیقی و تنقیدی کتاب: **مُشتاق احمد یوسُفی؛ شخصیت اور فن [پاکستانی ادب کے معمار]**، مصنف: طارق حبیب، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، اشاعت: ۲۰۰۸ء

(۳۹) ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، مضمون: ''اُردو ادب اور تحریکِ احیائے اقدارِ اسلامی''، مشمولہ: **پاکستانی ادب**، مرتبہ: رشید امجد، ڈاکٹر، فاروق علی، راولپنڈی، فیڈرل گورنمنٹ سرسیّد کالج، جلد: ۵، ۱۹۸۲ء، ص: ۴۰۰، ۴۰۱

فہرستِ منابع : [الف بائی ترتیب کے ساتھ]:

۱۔ **ادب اور اِسلامی قدریں**، از: اسرار احمد خان سہاروی، کراچی، مکتبہ چراغِ راہ، سن: ندارد

۲۔ **ادب، کلچر اور مسائل** از: جمیل جالبی، ڈاکٹر، مرتبہ: خاور جمیل، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، سالِ اشاعت: ۱۹۸۸ء

۳۔ **اُردو ادب کی تحریکیں**، از انور سدید، ڈاکٹر، کراچی، انجمن ترقیِ اُردو پاکستان، اشاعت دوم: ۱۹۹۱ء

۴۔ **اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ (آغاز سے 2000ء تک)** از سلیم اختر، ڈاکٹر، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء

۵۔ **اُردو ادب میں رُومانوی تحریک**، محمد حسن، ڈاکٹر، لاہور، شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، سنِ اشاعت: ندارد

۶۔ **اُردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات** از ساجد امجد، پروفیسر ڈاکٹر، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، سالِ اشاعت: ۲۰۰۳ء

۷۔ **اُردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر** از غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، اشاعت: ۱۹۹۸ء

۸۔ **اسلامی نظریۂ ادب** از سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، لاہور، ادارہ ترجمان القرآن، اشاعت: ۱۹۸۸ء
۹۔ **اشارات** از آفتاب احمد، ڈاکٹر، کراچی، مکتبہ دانیال، اشاعت اوّل: اگست ۱۹۹۶ء
۱۰۔ **بازیافت**، تحقیقی و تنقیدی مجلّہ، لاہور، شعبۂ اُردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی، شمارہ: ۱۲، جنوری ۲۰۰۸ء تا جون ۲۰۰۸ء
۱۱۔ **پاکستانی ادب**، مرتبہ: رشید امجد، ڈاکٹر، فاروق علی، راولپنڈی، فیڈرل گورنمنٹ سرسیّد کالج، جلد: ۵، ۱۹۸۲ء
۱۲۔ **پاکستانی ادب: ۱۹۴۷ء تا حال** از غفور شاہ قاسم، پروفیسر، لاہور، بک ٹاک کمپنی روڈ، اشاعت: ۱۹۹۵ء
۱۳۔ **پنجاب میں اُردو** از حافظ محمود شیرانی، لکھنؤ، اُتر پردیش اُردو اکادمی، دوسرا ایڈیشن: ۱۹۹۰ء
۱۴۔ **تحریکِ آزادی میں اُردو کا حصہ** از معین الدّین عقیل، ڈاکٹر، لاہور، مجلس ترقّیِ ادب، اشاعت اوّل: جون ۲۰۰۸ء
۱۵۔ **تخلیقی عمل اور اُسلوب**، از: محمد حسن عسکری، کراچی، نفیس اکیڈمی اُردو بازار، طبع: ۱۹۸۹ء
۱۶۔ **جنگ**، لاہور، قومی روزنامہ، ادبی ایڈیشن، جلد: ۷، یکم جولائی ۱۹۸۶ء
۱۷۔ **سیپ**، کراچی، ماہ نامہ، شمارہ: ۳۱، جلد: ندارد
۱۸۔ **فنِ تنقید اور اُردو تنقید نگاری** از نورالحسن نقوی، ڈاکٹر، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، بار اوّل: ۱۹۹۰ء
۱۹۔ **مجموعۂ محمد حسن عسکری** از محمد حسن عسکری، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، اشاعت: ۱۹۹۴ء
۲۰۔ **ماہِ نو**، لاہور، ماہ نامہ، گولڈن جوبلی نمبر، جلد: ۵۰، شمارہ: ۸، اگست ۱۹۹۷ء
۲۱۔ **محمد بن قاسم**، از: نسیم حجازی، لاہور، قومی کتب خانہ، سنِ اشاعت: ندارد
۲۲۔ مشتاق احمد یوسفی؛ **چراغ تلے سے آبِ گم تک**، مرتّب: طارق حبیب، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، اشاعت دوم: ستمبر ۲۰۰۶ء
۲۳۔ مشتاق احمد یوسفی؛ **شخصیت اور فن [پاکستانی ادب کے معمار]**، مصنف: طارق حبیب، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، اشاعت: ۲۰۰۸ء
۲۴۔ **نئی تنقید** از جمیل جالبی، ڈاکٹر، مرتب: خاور جمیل، دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، سالِ اشاعت: ۱۹۸۸ء
۲۵۔ **نئی شاعری**، نامقبول شاعری، از: سلیم احمد، کراچی، نفیس اکیڈمی، اُردو بازار، طبع: اگست ۱۹۸۹ء
۲۶۔ **نئی نظم اور پورا آدمی**، از: سلیم احمد، کراچی، نفیس اکیڈمی، اُردو بازار، طبع: اگست ۱۹۸۹ء
۲۷۔ **یوسُفیات** [مشتاق احمد یوسفی؛ سوانح، فکر اور فن]، مصنفہ: طارق حبیب، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء